۱۹۷۵ء کی

بہترین نظمیں

مرتب

انور سدید

سنہ ۱۹۷۵ء

کی

بہترین نظمیں

مرتب

انور سدید

مکتبہ اُردو زبان، ریلوے روڈ سرگودھا

طبع	اوّل
تعداد	پانچ سو
کتابت	تمکین شیرازی
ناشر	نصرت انوار
مطبع	الوفا پرنٹنگ پریس لاہور
طابع	مکتبۂ اردو زبان سرگودھا۔

ماہ وسالِ اشاعت، اپریل ۱۹۷۶ء

قیمت

چھ روپے

ن۔م۔راشد

اور

مجید امجد

کے نام

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

رسائل

جن سے استفادہ کیا گیا

اوراق	لاہور	تخلیق	لاہور
نیا دَور	کراچی	جامِ نو	کراچی
سیپ	کراچی	اُردو ڈائجسٹ	لاہور
فنون	لاہور		
پاکستانی ادب	کراچی		
افکار	کراچی		
الفاظ	کراچی		
سویرا	لاہور		
تحریریں	لاہور		
قند	پشاور		
نیرنگِ خیال	راولپنڈی		
المشجاب	کراچی		
نئی قدریں	حیدر آباد		

بہترین نظمیں

انور سدید	پیش لفظ	۹
ن۔م۔ راشد	نیا آدمی	۲۱
فیض احمد فیض	بہار آئی	۲۴
ضیا جالندھری	سُرخ ہَوا	۲۶
وزیر آغا	دست بستہ کھڑا ہوں	۲۸
عارف عبدالمتین	چراغ کا گھاؤ	۳۲
بلراج کومل	پتھراؤ	۳۴
شاذ تمکنت	برف باری	۳۶
عرش صدیقی	اپنی مٹی کی خوشبو	۳۷
اعجاز فاروقی	داستاں در داستاں	۳۹
محمد سلیم الرحمٰن	نظم	۴۴

بشر نواز	اجنبی سمندر	۴۶
کرشن ادیب	رَو میں ہے رخشِ عمر	۴۹
ادیب سہیل	داغ پانی کے	۵۱
زاہد ڈار	نظم	۵۳
ذوالفقار احمد تابش	نظم	۵۸
سحر انصاری	دیمک	۶۰
تبسم کاشمیری	جسم کے اندر جسم کے باہر	۶۲
اظہر جاوید	منافق دوستوں کے لئے ایک نظم	۶۴
امجد اسلام امجد	گلہ	۶۷
سہیل احمد	ایک موسم کے دوستور کے لئے نظم	۶۹
سرمد صہبائی	ناچ اے نرتکی	۷۲
ریاض مجید	دائمی رفاقت کی بشارت	۷۶
انور محمود خالد	دس دن پہلے	۷۸
فہمیدہ ریاض	جاگتی مٹی	۸۱
سرور کامران	صبح کی دُعا	۸۴
ناہید قاسمی	خانہ بدوش	۸۷
حامد جیلانی	کوئی دُود سے بن جاتا ہے وجود	۸۹
پروین شاکر	بائیسویں صلیب	۹۱
خورشید رضوی	نیلے پہاڑ	۹۶

سجاد بابر	سامنا	۹۸
آذر تمنا	زندہ رہنے کی کوشش	۱۰۰
اصغر ندیم سید	اپنی موت پر ایک نظم	۱۰۲
ظفر سلطان	راہباؤں کے نام	۱۰۵

نوحے

جمیل ملک	نسیم شمائل پوری کی یاد میں	۱۰۷
اسرار زیدی	اپنی ذات کا نوحہ	۱۰۹
مسعود منور	مجید امجد کے لئے ایک سوز	۱۱۱

پیش لفظ

اردو ادب کے اس واقعے نے ابھی تک بہت سے لوگوں کو پیچھے میں ڈال رکھا ہے کہ ماضی قریب میں نظم کے چند بہترین شعرا اچانک غزل کی طرف کیوں متوجہ ہو گئے۔ بیشتر شعرا نے تو قاری کی اس حیرت کو اہمیت نہیں دی، تاہم چند ایک شعرا نے اس مراجعت کی وضاحت ضروری سمجھی اور بتایا کہ ایک طویل عرصے تک نچلی منزل میں سانس لینے کے بعد اب وہ وسیع تر زندگی کا مشاہدہ بالائی منزل سے کرنے کے آرزومند ہیں۔ نظم سے غزل کی طرف اس مراجعت کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو غزل جو ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کی وفات کے بعد ایک عارضی انجماد کی زد میں آچکی تھی ہوا کے اس تازہ جھونکے سے پھر کھل اٹھی اور اس میں موضوعات کا تنوع ہی پیدا نہ ہوا بلکہ نظم کے شعرا نے اس کی موضوعی ہیئت کو بھی یکسر بدل ڈالا اور ایسے رجحانات کی عکاسی بھی ہونے لگی جنہیں اس سے قبل صرف نظم کی اقلیم سخن میں ہی داخلے کی اجازت تھی اور اردو غزل کی عمومیت جنہیں قبول کرنے سے گریزاں تھی۔ دوسری طرف نقصان یہ ہوا کہ اردو نظم پر غزل کو فوقیت دینے کا رجحان ایک مرتبہ پھر اہمیت حاصل کرنے لگا اور نظم مبینہ طور پر بقول شخصے انحطاط و زوال

کا نمونہ پیش کرنے لگی۔

اس زمانے میں ادب کے ثقہ مراکز سے جو نعرہ بلند ہوا وہ بالواسطہ طور پر تو غزل کی حمایت میں ہی تھا لیکن اس کی زد پر براہِ راست نظم کے شعراء آئے اور انہیں متنبہ کیا گیا کہ گزشتہ چند سالوں میں اچھی نظم تخلیق نہیں ہوئی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس اہم حادثے کی ادبی اور نفسیاتی وجوہ تلاش کی جاتیں اور معلوم کیا جاتا کہ کیا نظم کا تخلیقی عمل واقعی کمزور پڑ گیا ہے یا نظم پر معاشرے کی عمومی حالت اثر انداز ہو رہی ہے اور شاعر صرف دھندلی چیزوں کو دیکھنے میں مصروف ہے اور ذات کی غواصی کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا۔ لیکن ہوا یہ کہ نعرہ تاثر کی خلوط وحدانی میں ٹی ہاؤس کی فضا میں گونجتا رہا اور وجوہ تلاش کرنے کی طرف توجہ منعطف نہ ہو سکی

تاریخی اعتبار سے دیکھئے تو یہ وہی زمانہ ہے جب نئے رجحانات، نئے خیالات اور نئے تصورات کو پروان چڑھانے والے ادبی پرچے ایک مخصوص سیاسی ادبی گروہ کی ذاتی الزام تراشیوں کی تاب نہ لاکر بالآخر ان کے منفی رویئے کے آگے سپر ڈال چکے تھے اور میدان ان رسائل کے ہاتھ میں تھا جو ادب کو مقصد کے بادیہ کے مطابق استعمال کرنے کی سعی کرتے ہیں اور مشاعرے میں جو داد ابھرتی ہے اسے شعر کا معیار تصور کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے تصورات کا دھارا اشاعت سے محروم ہو گیا اور قاری اس شاعری سے مانوس ہونے لگا جس میں پروپیگنڈہ سطحی انداز اختیار کر لیتا ہے اور قاری کو صرف ایک خاص انداز میں ہی متاثر کرتا ہے۔

کسی ایک صنفِ سخن کا دوسری صنفِ سخن پر مسابقت حاصل کرنے کا رجحان خارجی جبر اور ادبی منصوبہ بندی کے برعکس آزادانہ اور فطری ہو تو چنداں خطرناک

نہیں ہوتا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو نظم کے شعراء نے غزل کی طرف مراجعت منصوبہ بندی کے برعکس ایک وجدانی کیفیت کے زیرِ اثر کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے فن نے غزل کے جن نئے گوشوں کو ابھارا ان کی پذیرائی زیادہ ہوئی اور نظم کے خلاف جو نعرہ اٹھایا گیا وہ اس لئے فروغ حاصل نہ کر سکا کہ جدیدیت کو فروغ دینے والے رسائل نے اشاعت دوبارہ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اچھی نظم کی روشناسی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ اچانک بہت سی نظموں کی اشاعت سے پوری ہو گئی۔

بادی النظر میں نظم اور غزل کی تخلیق میں نچلی اور بالائی منزل کا نکتہ صرف اس بات کا اظہار ہے کہ نظم میں قریبی اور باریک مشاہدہ عمق اور گہرائی پیدا کرتا ہے اور تخلیقی عمل انکشافِ ذات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ دوسری طرف غزل چونکہ انبوہ کے رجحانات کی آئینہ دار ہے اس لئے اس میں کردار اپنی انفرادی شخصیت ایک بڑے کُل میں مدغم کر دیتا ہے اور فاصلہ ایک عالمگیر عمومیت کو سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ جب بیداری اور تحریک کی فضا عام ہو تو غزل تخلیق ہوتی ہے اور جب معاشرہ ہموار اور معتدل صورت اختیار کر لے تو فرد اجتماع سے نظر ہٹا کر اپنی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس زمانے میں بالعموم نظم کو فروغ ملتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں نظم سے غزل کی طرف مراجعت دراصل اس حقیقت کا اعلامیہ تھا کہ معاشرہ انتشار کا شکار ہے اور اگر آپ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال کو جو بالآخر سقوطِ ڈھاکہ پر منتج ہوئی ملحوظ رکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ اس زمانے کے پیچ و خم اور مد و جزر کو غزل ہی اپنے دامنِ عافیت میں پناہ دے سکتی تھی۔ اس دور میں نظمیں بھی لکھی گئیں لیکن یہ نظمیں داخلی کم اور خارجی زیادہ تھیں اور ان کی نوعیت زیادہ تر موضوعاتی

تھی۔ چنانچہ ان نظموں نے قومی اور ملی جذبات کو خارجی سطح پر بڑی خوبی سے طغیانِ عمل عطا کیا لیکن وہ کیفیت جو جذبے کی تقلیب کے بعد پیدا ہوتی ہے ظاہر نہ ہو سکی۔

گذشتہ سال نظم میں ایک بار پھر قوت اور زندگی کی لہریں پیدا ہو گئیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب زندگی میں توازن اور اعتدال کے آثار ہویدا ہیں۔ اور شاعر اپنے داخل میں غوطہ زن ہو کر اپنی ذات کے گہرے تاثر کو مطلع پر لانے کے لئے صنفِ نظم کے امکانات آزمانے پر آمادہ ہے۔ میں ان معروضات کی روشنی میں گذشتہ سال کی بہترین نظموں کا تجزیہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

گزشتہ سال کے غالب رجحانات متعین کرنے کی سعی کریں تو سب سے پہلے نئے آدمی کی تلاش ایک غالب رجحان کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ن۔م راشد نے اس نئے آدمی کی توجیہہ فلسفے کی سطح پر کی ہے اور نئے آدمی کا نزول لفظ و معنی کے ایک ایسے نکتے سے تعبیر کیا ہے جس کی جدت کو اوّلین سطح پر زمانہ قبول نہیں کرتا لیکن بعد میں جب یہ نکتہ مقبولیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ زمانہ تعلق قائم کرنے میں تفاخر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ن۔م راشد کی نظم "نیا آدمی" نوا اور سازِ طرب کو ایک نئے آہنگ میں پیش کرتی ہے۔ فیض کی دانست میں یہ نیا آدمی درحقیقت بہار ہے۔ جو آتی ہے تو اپنے ساتھ عدم سے خواب اور شباب ہمراہ لاتی ہے۔ ان دونوں فیض کے لہجے میں نشاطیہ عنصر بالخصوص نمایاں ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے رومانوی انداز میں ملالِ احوالِ دوستاں کم اور خمارِ آغوشِ مہ وشاں زیادہ ہے اور ان کی نظم "بہار آئی" اس جاں افروز کیفیت کا عمدہ مظہر ہے۔

وزیر آغا کی نظم "دست بستہ کھڑا ہوں" اس نئے انسان کو خارج کے بجائے

اپنے داخل میں تلاش کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔" ہوا" جو زمانے کی علامت ہے اس نظم میں ایک ایسی نابینا بھکاری لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے جو خارج سے اجالے کی بھیک مانگ رہی ہے۔ شاعر نے لاشعوری طور پر نظم کا پیکر کچھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس سے سریلی تاثریت جھلکنے لگی ہے۔ چنانچہ زندگی کی دم روکنے والی کیفیت جب فطرت کے داخلی تموّج سے مس کرتی ہے تو رنگوں کی جوالا پھوٹ نکلتی ہے۔ اور فرد کی ذات اس جوالا میں کندن بن کر دمکنے لگتی ہے۔ زاہد ڈار کے ہاں یہ انسان ابھی تک ظہور میں نہیں آیا۔ چنانچہ اپنی نظم میں زاہد ڈار نے اُن لوگوں کی آواز سننے کا مشورہ دیا ہے جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے۔ اور یوں بالواسطہ طور پر زاہد ڈار نے بھی اندر کے انسان کو اہمیت دینے اور اسے جگا کر فطرت کی سرگوشی سننے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

عارف عبدالمتین کی نظم" چراغ کا گھاؤ" میں یہ انسان زمانے کے منفی ردِّ عمل کا شکار ہو چکا ہے اور اب تمناؤں کے نارسا اور سنگدل فرش پر سے اپنے صد پارہ احساس کی کرچیاں چُن رہا ہے۔ اس زاویئے کی ایک اور عمدہ نظم ضیا جالندھری کی "سُرخ ہوا" ہے۔ اس نظم میں سُرخ ہوا انتشار اور تخریب کی علامت ہے اور یہ سُورج کا لاوا بن کر سانسوں میں انگارے بھر رہی ہے۔ عرش صدیقی کی نظم" اپنی مٹی کی خوشبو" ان انسانوں میں اعتماد بحال کرتی ہے جنہیں ہم چھوڑ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے عرش صدیقی نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ نیا انسان تو دنیا سے رُخصت بھی ہو چکا ہے اور زمانۂ حال کا انسان درحقیقت اکھڑا ہوا انسان ہے۔ چنانچہ یہ نظم شاعر کی ایک دلدوز کیفیت کو سامنے لاتی ہے۔

ان سب نظموں کی مشترک خوبی یہ ہے کہ ان میں شعراء نے بظاہر اپنا ذاتی تجربہ ہی پیش کیا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ راشد آج بھی اس بغاوت پر آمادہ ہے جو اس نے ماورا کے زمانے میں کی تھی اور ٹھوکر کھائے تھے۔ فیض "داغ داغ اجالا" اور "شب گزیدہ سحر" کے بعد آسودگی کی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ وزیر آغا حسبِ معمول داخل میں غوّاصی کرنے اور عرفانِ حیات حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ عارف عبدالمتین قدروں کی شکست و ریخت اور انسان کے گرگٹی انداز پر حیرت زدہ ہے۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ ان شعراء نے ملکی تصورات کو نظر انداز نہیں کیا اور موجودہ زمانے کی روش پر اپنا تخلیقی ردِ عمل خوبصورت انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ ردِ عمل فیض کے ہاں رومانویت کے لوچدار انداز میں، وزیر آغا کے ہاں ماورائی کیفیت میں اور عارف عبدالمتین اور عرش صدیقی کے ہاں گھر کی علامت میں ڈھل گیا ہے اور بے حد متاثر کرتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں مظاہرِ فطرت سے متاثر ہونے کا رجحان اردو نظم میں بالخصوص نمایاں ہے۔ گذشتہ سال بھی اس رجحان کی کئی عمدہ نظمیں تخلیق ہوئیں — خورشید رضوی کی نظم "نیلے پہاڑ" میں فطرت کے ساتھ لپٹنے اور حاضر و موجود کا قفل توڑ ڈالنے کا جذبہ موجزن ہے۔ شاذ تمکنت نے "برف باری" کے منظر کو اپنی ذات پر وارد کیا ہے اور اس آگ کو کریدنے کی کوشش کی ہے جس پر راکھ سی جم چکی ہے ذوالفقار احمد تابش نے صبح کے ایک تلاطم خیز منظر کو فنی رعنائی سے گرفت میں لیا اور اسے اپنے داخلی خلفشار کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا۔ فطرت کے دو منفرد زاویئے سحر انصاری کی نظم "دیمک" اور ادیب سہیل کی نظم "داغ پانی کے" میں ظاہر ہوئے ہیں ان دونوں نظموں میں شعرا نے فطرت کے ایک معمولی مشاہدے کو واقعے کی تمثیل

میں پیش کیا ہے اور فطرت کا تخریبی زاویہ ابھارا ہے۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے تخریب سے تعمیر کا قیمتی عنصر بھی تلاش کیا ہے۔ چنانچہ سحر انصاری نے یہ سوال اٹھایا کہ تاراجیِ حرف و قرطاس میں مٹی کے گھر تعمیر کرنے کا فن حرف و تصدیق کے کن معانی کو سامنے لاتا ہے؛ اور ادیب سہیل اس انکشاف پر مطمئن ہے کہ اسے پانی کے داغوں میں جانے پہچانے چہروں کا عکس نظر آتا ہے۔ ان نظموں کا رجائی انداز بالخصوص متاثر کرتا ہے۔

لمحۂ موجود کو اہمیت دینے، اس سے رس نچوڑنے اور اکتسابِ مسرت کرنے کا اعلان بھی گزشتہ سال کئی شعراء کے ہاں بالخصوص نمایاں ہوا۔ بشر نواز کی نظم "اجنبی سمندر" میں یہ لمحۂ مسرت گرفت میں نہیں آتا۔ لہٰذا زہر ناک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف کرشن ادیب نے "رَو میں ہے رخشِ عمر..." میں ماضی اور حال کے تمام لمحات کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے اور وہ ان سے قطرہ قطرہ رس نچوڑ کر وزدیدہ لذتوں کو سیراب کر رہا ہے۔ سرمد صہبائی نے اس لمحے کو موہنجوڈرو کی رقاصہ (نظم "ناچ اے زنگی") کی صورت میں دیکھا ہے اور جسم کے گہنائے ہوئے مہتاب کو زنگی کے رقص سے زندہ کرنا چاہا ہے۔ ریاض مجید کی نظم "دائمی رفاقت کی بشارت" میں لمحے کی سلگتی ہوئی آگ راکھ میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ ابھی اس کے سر میں آوازۂ شور و شر گونجتا ہے اور اس کے ہاتھ پر ایک روشن زمانے کی آمد مرقوم ہے۔ نارسائی کا یہ فاصلہ انور محمود خالد کی نظم "دس دن پہلے" میں بھی موجود ہے اور اس کے ہاں فطرت ایک خیال انگیز وحشت بن کر مہک آلود پروائی میں یکسر ڈوب جاتی ہے۔ ناہید قاسمی کی نظم "خانہ بدوش" لمحے کی معصوم مسرت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس نظم کا موضوع اگرچہ طبقاتی

تضاد ہے لیکن شاعرہ نے موضوع کو بڑی خوبی سے تخلیق کی زیریں سطح سے ابھرنے نہیں دیا اور فطرت کے اس زاویئے کو ابھارا ہے جو امیر اور غریب دونوں میں مشترک ہے۔ پروین شاکر لمحے سے خالص نسائی مسرت اکتساب کرنے کی آرزو مند ہے اور زندگی کی "بائیسویں صلیب" پر ایسی برسات کی منتظر ہے جو اس کی مرگ بجاں روح کو حیاتِ نو دے دے۔ آذر تمنا کی نظم "زندہ رہنے کی کوشش" میں لمحہ ایک زندہ حقیقت بن گیا ہے اور وہ مسرت کے اس لمحے میں جیسے ساری دنیا کی سرخوشیاں سمیٹ چکا ہے۔ ظفر سلطان نے نظم "راہباؤں کے نام" میں زندگی سے فرار کو غیر فطری قرار دیا ہے اور راہباؤں کو بالواسطہ طور پر مشورہ دیا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقی لعنتوں سے گریزاں نہ ہوں۔ اس نظم کا اظہار مستقیم مگر تاثر بالواسطہ ہے۔

گزشتہ سال دوستوں کو مخاطب کر کے نظمیں کہنے کا ایک نیا رجحان بھی سامنے آیا ہے اس سلسلے کی نظموں میں اوّلین سطح پر وہ لوگ سامنے آئے ہیں جنہوں نے دوست کو اپنی ذات کا جزو بنانے کے بجائے اسے منافقت کے خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی چنانچہ اس کا ایک روپ تو اعجاز فاروقی کی نظم "داستاں در داستاں" میں ناگن کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ ناگن نور کے دریا پر جھپٹ کر نیلے اور سبز اور پیلے رنگوں کو چاٹنے میں مصروف ہے سلیم الرحمٰن نے اپنی بے عنوان نظم میں اس ناگن کو تباہ چہروں کی تجرید میں مشاہدہ کیا ہے۔ اس رجحان کا نسبتاً واضح روپ اظہر جاوید کی نظم "منافق دوستوں کے لئے ایک نظم" میں مستقیم انداز میں ابھرا ہے اور یہاں شاعر دوست کے ہاتھوں شگسار ہی نہیں ہوا بلکہ اب وہ صلیب کاندھے پر اٹھائے ان زخموں کی عبادت بھی کر رہا ہے۔ امجد اسلام امجد کی نظم "گلہ" میں یہ تاثر نسبتاً پھیل گیا ہے۔ تاہم اس کے زیرِ لب دھیمے لہجے نے درد کی ایک

خاص کیفیت کو جسم دیا ہے اور یہی اس نظم کی خوبی ہے۔ اصغر ندیم سید نے "اپنی موت پر ایک نظم" میں کاروبارِ زندگی کی منافقتوں کو اجاگر کیا ہے۔ شکایتوں کی اس فضا میں ایک خوشگوار تاثر سہیل احمد نے پیدا کیا ہے اور یہ متذکرہ رجحان کا نسبتاً روشن زاویہ ہے۔ سہیل احمد کے ہاں اڑتا پرندہ وقت کی علامت ہے۔ اور یہ کونج کی تمثال میں ہجرتوں کی داستانیں سناتا ہے۔ سہیل احمد کی نظم "ایک موسم کے دوستوں کے لئے ....." میں محبت کا عالمگیر جذبہ ابھرتا ہے اور وہ دوست سامنے آتے ہیں جن کے ساتھ شاعر نے محبت کی بہاریں گزاری ہیں اور اب یہ بیتے دن تالاب کے پانیوں پر پھڑپھڑا رہے ہیں تو شاعر ان مسرتوں کی تجدید کے لئے مضطرب ہے۔

رجحانات کے متذکرہ دائروں سے ہٹ کر نظر دوڑائیں تو بلراج کومل کی نظم "بھیڑاؤ" ایک ایسی قابلِ قدر تخلیق ہے جو شاعر کے فکری ارتقاء کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بلراج کومل نے بغاوت پسند لڑکوں کی نراجی کیفیت کو اپنے داخل کے وحشی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اور یوں دلی کے سوئے ہوئے سناٹوں کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ تبسم کاشمیری کی نظم، "جسم کے اندر جسم کے باہر" اس انسان کا نوحہ ہے جس کے جسم پر اندھی چیزوں نے یلغار کر رکھی ہے اور خوف کا تیکھا لشکارا جس کے بدن کو کاٹ رہا ہے" صبح کی دُھند" میں سرور کامران نے ماں کی تقدیس کا ایک پُرعظمت زاویہ ابھارا ہے۔ حامد جیلانی نے نظم "کوئی دُود سے بن جاتا ہے وجود" میں دُود سے وجود کو جنم دیا ہے اور پھر اس وجود کی لذت میں پناہ تلاش کی ہے۔ سجاد بابر نے نظم "سامنا" میں خارج کی عفونت سے آنکھ بند کرنے کے بجائے یہ عفونت دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ گزشتہ سال زیادہ طویل اور بے حد مختصر نظم لکھنے کا رجحان کچھ

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

زیادہ مقبول نہ ہوسکا۔ طویل نظم کی فارم کو ن۔م۔ راشد اور مختار صدیقی بالخصوص کامیابی سے استعمال کر چکے ہیں۔ ان کے بعد مراتب اختر اور سرمد صہبائی نے طویل نظم میں جذبے کی اکائی کو قائم رکھنے کی سعی کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعراء ریڈیو۔ ٹی۔ وی اور اخبارات کے لئے لکھنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ خالص تخلیقی نظم کے لئے عرفان کا طویل وقفہ میسر نہیں آسکا اور یوں طویل نظم کی کوئی کامیاب تخلیق سامنے نہ آسکی۔

گزشتہ سال کے دوران میں یہ بات بھی بالخصوص واضح ہوئی کہ ثقہ شعراء کے شانہ بشانہ نسبتاً نووارد شعرا نے بھی کامیاب نظمیں کہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نظم میں نئے خون کی جو لہر رواں شامل ہو رہی ہے اور اس کے مستقبل سے مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ بیشتر شعراء نے داخل کی پُراسرار سرگوشی کو سننے اور اس وجدانی کیفیت کو پوری ساحری سے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ لہجے کی گھن گرج، اضافتوں کا تحرک عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کا استعمالِ فراواں بڑی حد تک کم ہوگیا اور ان کی جگہ شعراء نے اپنے وطن کی سرزمین کو اہمیت دی اور ایسی علامتیں، تمثالیں اور تشبیہیں تخلیق کیں جو زندگی کے علاوہ موجود چیزوں کی اہمیت واضح کرتی تھیں اور قاری کو ان میں غرابت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیشتر وہ شعراء بھی جن کے نزدیک شاعری عقیدے کے واضح اظہار کے بغیر بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ سامنے کے مشاہدے کو فوری طور پر الفاظ کا جامہ پہنانے میں تعمیل کرتے ہیں۔

گزشتہ سال داخل تجربے اور انکشافِ ذات کے عمل سے گزرے اور بے حد خوبصورت نظمیں تخلیق کیں۔ چنانچہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ایک مخصوص ترقی پسند سانچے کی نظموں کے مقابلے میں شاعری کا وجدانی زاویہ زیادہ مقبول ہوا۔

شاعری کے مسائل کے سلسلے میں "نثری نظم" کے مسئلے نے گزشتہ سال خاصی گرد اڑائی۔ کچھ عرصہ قبل چند ناراض نوجوانوں نے نئی لسانی تشکیلات کا شاخسانہ کھڑا کیا تھا لیکن جب عوام کی طرف سے اسے پذیرائی نہ مل سکی تو یہ نوجوان اپنی شکستگی کا سامنا بھی نہ کر سکے اور اپنی صدائے بازگشت میں ہی گم ہو گئے۔ "نثری نظم" کا شاخسانہ بھی چند ایسے سہل انگار نوجوانوں کی اختراع ہے جو ابھی تک فن کی مبتدیانہ سطح سے تو بلند نہیں ہو سکے لیکن تخلیقِ فن کے ساتھ وابستگی کے آرزو مند ضرور ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد علی صدیقی نے اس ناپختہ تجربے پر فنی نوعیت کے اعتراض اٹھائے ہیں اور نوجوان شعرا کو مشورہ دیا ہے کہ وہ فن کے لئے جس تخلیقی ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اسے پورا کرنے کی سعی کریں۔ اول الذکر کا موقف یہ بھی ہے کہ اس قسم کا تجربہ ربع صدی قبل "نیرنگِ خیال" کی بساط پر کیا جا چکا ہے لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسی تخلیقات کے لئے جن میں نثر کی ہیئت اور نظم کی تخیلی پرواز کا امتزاج ہو "نثرِ لطیف" کا نام تجویز کیا اور اب یہ نام اتنی مقبولیت حاصل کر گیا ہے کہ ادبا اس صنف کے تحت ہر صنفِ سخن میں وجدانی نثرِ لطیف تخلیق کر رہے ہیں۔

تو یہ تھا ۱۹۷۵ء کی نظم کا ایک مختصر سا جائزہ!

اردو نظموں کے بہترین انتخاب شائع کرنے کی روایت اب نئی نہیں رہی۔ مکتبہ اُردو زبان اس سے قبل ادب کے دو انتخاب پیش کر چکا ہے اور انہیں اہلِ ادب نے حسبِ توقع پذیرائی عطا کی۔ اب کے سال یہ انتخاب صرف بہترین نظموں تک محدود رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاعتِ کتب کا کام اب اتنا مہنگا ہو گیا

ہے کہ منافع شامل نہ کرنے کے باوجود مکتبہ اردو زبان کی بساط سے اخراجات تجاوز کر چکے ہیں۔ اس لئے ہم اس انتخاب میں صرف نظمیں شامل کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر انتخاب میں کراچی، لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور کے پانچ اہلِ قلم شریک ہوئے۔ شعراء کے نام صیغۂ راز میں رکھے گئے اور منصفین سے استدعا کی گئی کہ وہ بہترین نظموں کو نشان زد کر دیں۔ میں نے ان آراء کی روشنی میں بہترین نظموں کو صرف مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب پر چونکہ منصفین کے نام شائع نہیں ہو رہے اس لئے انتخاب کی تمام ذمہ داری کو میں قبول کرتا ہوں اور ان شعراء سے جن کی شاندار نظمیں اس انتخاب میں شامل نہیں ہو سکیں معذرت خواہ ہوں۔ نئے شعراء کی ایک بڑی تعداد کی شرکت اس حقیقت کی غماز ہے کہ انتخاب میں بڑے نام کے بجائے بڑی نظم کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس معیار کو آئندہ بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مجھے اس بات کا اظہار بھی کرنا ہے کہ بعض شعراء کی دو یا دو سے زیادہ نظمیں منتخب ہوئیں لیکن مجوزہ اصول کو قائم رکھنے کے لئے صرف ایک نظم ہی شریکِ اشاعت کی گئی ہے۔ زیرِ نظر انتخاب صرف پاکستان کے ادبی پرچوں سے ماخوذ ہے۔ اس لئے اس میں صرف وہی ہندوستانی شعراء شریک ہیں جن کی نظموں کی اشاعت پاکستان کے رسائل میں ہوئی۔

آخر میں مجھے ان سب شعراء اور ادبی رسائل کے مدیران کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے تعاون سے یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ آئندہ سال کا انتخاب ابھی سے زیرِ عمل ہے اور پاکستان کے پانچ اہم شہروں میں حسبِ سابق بہترین نظموں کو منتخب کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

انور سدید

ن۔م راشد

نیا آدمی

نوا اور سازِ طرب

یہ سازِ طرب میں نوائے تمنّا
نوائے تمنّا پہ کوچے کے لڑکوں کے پتھر
یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سرور!
نئی آگ، دل
دلِ ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور!
نئی آگ سب سے مقدّس ہمیں
اسے آج کس کس کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھائیں؟
نئی آگ کے کس کو معنی سجھائیں؟

نئی آگ ہر چشم و لب کا سرور
نئی آگ سب کا سرور

روایت، جنازہ۔
خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا!

جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کے شور و شغب کا سرور!

نئے آدمی کا نزول —
اور اس پر غضب کا سرور
(نئے آدمی کی اس آمد سے پہلے
مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں
— زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیئے —)
نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی
اور اس پر پرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں

فغاں کا غضب اور غضب کا سرور!

نئے آدمی کا ادب —
ادب اور نیا آدمی
نئے آدمی کی طلب کا سرور
نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں جن کا پایاں نہیں
گمانوں میں دانش برہنہ درختوں میں بادِ نسیم
برہنہ درختوں کے دل چیرتی!
نئے آدمی کا ادب
اور نئے آدمی کو ادب کا سرور.

(نیا دور)

فیض احمد فیض

بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے ہیں
جو مر کے ہر بار پھر جیے ہیں
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مُشک بو ہیں
جو تیرے عشّاق کا لہُو ہیں
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
جو بند آنکھوں میں کھو گئے تھے

جو سرد نبضوں میں سو رہے تھے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی
خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے سوال سارے
جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

(پاکستانی ادب)

ضیا جالندھری

سُرخ ہَوا

سُرخ ہوا تنوّر کہ جس میں شہر اور بستی ایندھن
سُرخ ہوا سُورج کا لاوا جس کا لمبا دامن
کہساروں کا لہو لہان کفن
سُرخ ہوا شاخوں سے چھنتی انگاروں کی سلگن
یہ انگارے جلتی بجھتی سانسوں میں بس جاتے ہیں

سُرخ ہَوا کے ہر جھونکے پر
کتنے پتّے جھڑ جاتے ہیں
سُرخ ہوا کی ہر جنبش پر
کتنے خواب اُجڑ جاتے ہیں

سُرخ ہَوا کی آنچ میں کتنے کومل جسم جُھلس جاتے ہیں

پیڑ ہیں یا پرچھائیاں، ان کی شاخیں ہیں یا سائے ہیں
اب جو کالی ردائیں پہنے
ڈھنڈ لے دیئے ہاتھوں میں لئے
بے عکس آئینوں میں اپنے چہرے ڈھونڈنے آئے ہیں
لیکن یہ آئینے کالے، آنکھوں کو ڈس جاتے ہیں

(نیا دَور)

ڈاکٹر وزیر آغا

دست بستہ کھڑا ہُوں

ہوا — ایک نابینا لڑکی ہے
آنکھوں کے جنگل میں ہاتھوں سے رستہ بناتے ہوئے چل رہی ہے
کوئی اُس کے کشکول میں میلا چاندی کا سکہ گرائے
جلی خشک روٹی کا ٹکڑا یا کاغذ کا پُرزہ اُسے دان دے تو — ہوا
اپنے محسن کو میٹھی سی کومل دُعا دے کے آگے کو بڑھتی ہے
اندھے ہیولوں میں لپٹی ہوئی منزلِ بے نشاں کی طرف
آسماں کی طرف

ازل سے میں اس اندھی لڑکی کے پیچھے

زمین پر گرے بھیک کے زرد ٹکڑوں پہ پلتا رہا ہوں
کسی منزلِ بے نشاں کی طرف سُست قدموں سے چلتا رہا ہوں
مگر اب مجھے اس سفر سے
چمکتی ہوئی سُرخ راکھی کے بندھن سے
اندھی ہوا کے چلن سے
کسی سے بھی رغبت نہیں ہے!
چلو (خود سے کہتا ہوں) اس اندھی لڑکی کا اب ساتھ چھوڑیں
شب و روز کے دائرے سے نکل کر

ذرا اپنی جانب بھی رُخ اپنا موڑیں،

میں اپنی طرف مُڑ گیا ہوں
مگر دیکھتا ہوں:
میں خود اپنے رستے میں اِک سبز جنگل کی صورت کھڑا ہوں
ہزاروں تنوں، اَن گنت شاخساروں، کروڑوں سمیہ جھاڑیوں سے
اَٹا ہوں
میں اِن ساری پگڈنڈیوں کو

جو میری طرف بے تحاشہ اُمڈنے لگی تھیں
بڑے شوق سے کھا رہا ہوں

میں اب تیرہ جنگل کی ٹیڑھی سیہ انگلیوں
سانپ ایسی مُڑی ٹہنیوں میں اُترنے لگا ہوں
اندھیرے کی دُنیا میں مشعل کی صورت بڑھا ہوں
تراشیدہ رستے تو جنگل کے باہر کہیں رہ گئے ہیں
گھنے تُند جنگل کے اندر میں خود اپنا رستہ بنا ہوں

عجب روشنی ہے
اندھیرے کے کشکول میں کس نے پھینکا یہ سونے کا دینار؟
جس سے شعاعوں کی کلیاں نکلنے لگیں
سارے جنگل کے پتّے زمرّد بنے، ٹہنیاں پیلے سونے کی
چھڑیاں ہوئیں
جھاڑیوں میں دہکنے لگے سُرخ پھولوں کے فانوس
سات رنگوں کی پریاں انوکھا سا اک رقص کرنے لگیں

اور پھر
میں نے دیکھا کہ میں اپنے ہی روبرو دست بستہ کھڑا ہوں
میں تاریک جنگل، خود اپنے ہی پرتو سے اندھا ہوا ہوں

(افکار)

عارف عبدالمتین

چراغ کا گھاؤ

میری روح کے سنگریزوں کو کس نے چُنا ہے،
ہر اک شخص میرے لہو سے اُبھرتی ہوئی روشنی کے سہارے
تمناؤں کے نارسا، سنگدل فرش سے،
خود اپنے ہی صد پارہ احساس کی کرچیاں چُن رہا ہے،
میں کس سے کہوں اور کیسے کہوں،
کہ میں اپنے قدموں سے لپٹے ہوئے اُس اندھیرے سے
تنگ آ گیا ہوں،
جو میرے ہی پیکر کی بے رحم تخلیق ہے!

سجا ہے کہ میں شب کے آغاز سے جل رہا ہوں،

اور اس شب کے انجام تک جلتے رہنے کی خواہش کا بھی ترجماں ہوں،
میں اپنے لہو کا بلیدان دینے کو تیار ہوں صبحدم تک
مگر وہ سحر جس کی امید پر میں نے اپنے ہی شعلے سے پُھکنا
گوارا کیا، رُوح کی خنکیوں سے کنارا کیا
اس کی آمد کا تا بندہ لمحہ

تصوّر کی موہوم حد سے بھی باہر نکلتا چلا جا رہا ہے،
اِدھر میرے اپنے لہو کا ذخیرہ بھی معدوم ہونے کو ہے،
اُدھر بادِ صرصر کے منہ زور جھونکے بھی میری سمٹتی ہوئی لَو پہ یلغار
کرنے کو ہیں!
میں خود اپنے قدموں سے لپٹے اندھیرے کو مانا کہ یکسر فراموش کر دوں،
مگر کس طرح سے مَیں اس خوں چکاں تیرگی کو بھلا دوں،
جو اُن غم کے ماروں کو ناگن کے مانند ڈسنے کو ہے،
جنہیں اپنے صد پارہ احساس کی کرچیاں چُنتے چُنتے زوال آ رہا ہے
میں کیسے کہوں، کس طرح سے کہوں، کس قیامت کا مجھ کو
خیال آ رہا ہے!!

(اوراق)

بلراج کومل

پتھراؤ

آوازیں، تصویریں، بچھڑے لوگوں کی
خوابوں کے دُھندلے درپن میں
اب چپکے چپکے ہنستی ہیں، میں روتا ہوں،
لیکن میں بھی کب روتا ہوں
سب رسمیں، ہنسنے رونے کی، ورثے میں پائی ہیں میں نے
دِل کی سب باتیں دل میں ہیں
آنکھوں اور ہونٹوں پر آنے والے سب منظر جھوٹے ہیں
سب پردے ہیں جو حائل ہیں
میرے اندر کے وحشی اور باہر کے روشن شہری ہیں

کچھ لڑکے رات کو آتے ہیں
بہتر اشغال سے فارغ ہیں
گالی، دشنام، زباں سوزی کی لذّت سے
شب کا سناٹا بھرتے ہیں
میں شہری ہوں، باعزّت روشن شہری ہوں
میرے اندر کا وحشی مجھ سے کہتا ہے
یہ لڑکے تیرے ساتھی ہیں
یہ سارے بندھن جھوٹے ہیں، یہ سارے پردے فاضل ہیں
گالی، دشنام، زباں سوزی کی لذّت سے
دِل کے سناٹوں کو بھر لے
کچھ پتھر لے اب ہاتھوں میں
کر پتھراؤ اس کوچے پر وہ آنگن ہے
جس کی مٹّی میں تیرے سب خوابوں کا مدفن ہے

(اوراق)

شاذ تمکنت

برف باری

زمستاں کی رُت، نیم شب، برف باری
بہ حدِ نظر تھرتھراتی ہوئی لَو،
فضائے دل و جاں کی شیون گزاری
درختانِ رفتہ ہواؤں کی زَد پر
خزاں دیدہ پتّے سسکتے ہوئے سے
ٹھٹھرتی ہوئی چاندنی، کانپتی ضَو
دریچوں کے شیشے درکتے ہوئے سے
کوئی چیخ، آواز، جھنکار، نغمہ!
روانیٔ خون گلو تھم رہی ہے
کُریدو! انگیٹھی کا سینہ کریدو
مری آگ پر راکھ سی جم رہی ہے

(الفاظ)

عرش صدیقی

اپنی مٹی کی خوشبو

میں جب بستی کی سرحد پر کھڑا ہو کر اُفق کی ڈوبتی راہوں کو تکتا تھا
تو وہ رو رو کے کہتی تھی
مجھے ڈر ہے، تجھے یہ نا ترس راہیں نہ کر ڈالیں جُدا مجھ سے
میں اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھ کر کہتا تھا، اب کیسا جُدا ہونا
مگر میں دل میں ڈرتا تھا کہ ان راہوں سے واقف تھا
انہی راہوں پہ چل کر اس دیارِ غیر میں آیا تھا اور یہ سوچ بیٹھا تھا
کہ یہ میرے سفر کی آخری منزل ہے، یہ انعام ہے میرا
مگر ہر دم
اُفق میں ڈوبتی راہیں،
گزرتے بادلوں کی روشنائی سے

ہوا میں کچھ پرانی بستیوں کے نام لکھتی تھیں
اُسے اک روز میں نے کہہ دیا، مجھ کو میرے اجداد کا مدفن بلاتا ہے
میری جاں مجھ کو جانا ہے
مگر تجھ بن نہ جاؤں گا
وہ اک بت کی طرح (سر کو جھکائے) چپ رہی لیکن
خموشی کو زباں کہیئے تو سب کچھ کہہ گئی مجھ سے!
جو آنسو اس کی پلکوں سے گرے تھے خشک مٹی پر
انہیں میں نے تڑپتے، سوچتے اور بولتے دیکھا
پھر اس شب اس کے پہلو سے میں اُٹھا اور افق میں
ڈوبتی راہوں پہ چلتا اپنے آبا کی اُسی
مٹی کی خوشبو کے تعاقب میں چلا آیا جو
میرے خوں میں پلتی تھی!
مجھے پہلو سے گم پاکر وہ سادہ بے زباں لڑکی مگر کیا سوچتی ہوگی!!

(اوراق)

اعجاز فاروقی

داستاں در داستاں

(۱)

نور کا دریا بہا
تو رات کی گیلی سیاہی میرے چہرے سے ڈھلی

پھیلتی قوسِ قزح
پھر آسمانوں سے اُتر کر
میری آنکھوں کے دریچے سے گزر کر
کالی دھرتی کے سیاہ گیلے بدن میں یوں سموئی
جیسے سورج چاند کو روشن کرے
بے محابا رنگ پھوٹے

اودے نیلے سبز پیلے
اور ان رنگوں سے موسیقی کے دھارے

میرے کانوں میں بہے
رنگ اور آواز
چشم و گوش
ہر سُو نور کا اک رقص
میری روح کی پہنائیوں میں ایک نغموں کا سروش
اور میرے پاؤں کی گیلی سیہ مٹی میں رنگوں کا خروش
رقص
میرے جسم کے ہر انگ میں کرنوں کے تیر
جسم کی ساری رگیں روشن ہوئیں
خون
جو اندھی رہوں میں کھولتا پھرتا تھا
اب تھا پُرسکوں
جسم کی اندھی رہوں میں
رقص تھا
کرنوں کا رقص!

(۲)

اور پھر آئی وہی ناگن
وہی زلفِ دراز
نور کے دریا پہ جھپٹی
اپنی زلفوں کی سیاہی اس میں گھولی
اودے نیلے سبز پیلے رنگ چاٹے
ہر طرف اپنے لہو کی شوخ سُرخی کو بکھیرا
ڈس گئی
تو خون پھر اندھی رہوں میں کھولتا پھرنے لگا
جسم پھر گیلی سیاہ مٹی سے آلودہ ہوا

(۳)

پھر کہیں سے اک سریلی مدھ بھری آواز
میرے کان میں اُتری
کسی کی ملتجی آنکھوں کے روزن میرے ہی تارِ نظر پر وا ہوئے
رقص — آوازوں کا رقص

آنکھ کی پُتلی کا رقص
پھول جیسے ہونٹ میرے رُخ سے پیوستہ ہوئے
میرا بدن قوسِ قزح میں ڈھل گیا
رنگ اور آواز
چشم و گوش
اس کے ہونٹ اور میری دُعا

(۴)

رقص میں تھی کائنات
دائرہ در دائرہ
پھیلتا بڑھتا ہوا
کہکشاں، سورج، ستارے، چاند، سیارے، زمین
ایک گردش میں اسیر
تیرگی اور روشنی کے دائرے بنتے ہوئے
اور یکایک چاند دو ٹکڑے ہوا
پھر وہ سونا آفتاب

اور بہتی ریت کی لہریں
کہیں افتاں کہیں خیزاں
زمیں جیسے غبارِ راہ بن کر اڑ رہی تھی
میرے سر پر نور کی کملی کا ٹھنڈا سائبان
جسم کا جادو ہوا باطل
میرے ہونٹوں میں جو الفاظ پتھر تھے
وہ جاگ اُٹھے
وہ "کُن" جو جسم کے پردوں میں محوِ خواب تھا
زندہ ہوا
تو کہکشاں، سورج، ستارے، چاند، سیارے
میرے اندر سے نکلے
ایک گردش میں اسیر!

(اوراق)

محمد سلیم الرحمٰن

نظم

سیاہ راتوں کے بے اماں راستوں پہ پھیلے ہوئے یہ چہرے
کہ جیسے پت جھڑ میں زرد پتّے بکھر گئے ہوں
بس ان کی بے چین زخم خوردہ سی پتلیوں میں رمق ہے باقی
جو گھومتی ہیں، جو منتظر ہیں۔

مرے زمانے میں پھل نہیں ہیں، فقط خزاں کے
زوال ہیں اور ایسے طوفاں کہ یاد اور روشنی کے اُونچے
درخت جڑ سے اُکھڑ گئے ہیں۔ امید نا آشنا دلوں میں
جو درد ہے راز بن چکا ہے، جو لفظ ہیں وہ اُجڑ رہے ہیں

مجھے اپنی خزاں میں جو چیز یاد ہے وہ ہر ایک رستے
یہ اُن گنت پتلیوں کی گردش کا کرب جیسے
ہزار ہا موم بتیاں جو مرے بدن اور میری آنکھوں
کو چھو کے بجھتی ہوں اور اندھیرے کو میرے اندر اتارتی ہوں

یہ پتلیاں جن میں گھومتے اور ڈوبتے ہیں سبھی ستارے
یہ آسمانوں کو تکنے والے تباہ چہرے،
تمام تجرید کے مرقعوں میں صف بہ صف منتظر ہیں مینھ کے
جو ان کی پامالیوں کو دھو کر سفید کر دے

جلے بجھے اور خام رنگوں کی گنجلک سے جگہ جگہ شق
یہ مرگِ انبوہ جس کی تہ میں دبی ہوئی آگ کی حرارت
ہے آخری فیصلوں کا موسم کہ آئینہ دار ہیں یہاں پہ
خود اپنے چہرے کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں شاید یا کھو چکا ہوں،

بشر نواز

اجنبی سمندر

پھر کسی انجانے جھونکے نے ہمیں
بیکراں کالے سمندر کے حوالے کر دیا
کف اڑاتی، چیختی سیّال دیواروں کے بیچ
کر دیا محصور ذہن و جسم کو کچھ اس طرح
اپنی مرضی سے ذرا جنبش بھی کر سکتے نہیں
موج سے جب موج ٹکراتی ہے، پل بھر کے لئے
آزاد ہو جاتے ہیں ہم

اپنی آزادی کی عمر
ایک سے
دوسرا

اور دوسرے سے تیسرا زندان بدل لینے کی مہلت پر محیط

اور ہم
اپنی اپنی سوچ سے لپٹے ہوئے
خوشنما منظر، انوکھے دائرے

نت نئے پیکر خلاؤں میں بنائے بہہ رہے ہیں چار سُو
چاند تاروں، اُڑنے والے طائروں کے عکس کے
پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں اپنی دیواروں کے ساتھ

اور جب بھی اتفاق
کچھ گریزاں عکسِ پرّاں ڈال دیتا ہے ہماری گود میں
ان کو اپنی کوششِ پیہم کا ثمرہ فرض کر لیتے ہیں ہم
اے سمندر اجنبی
اس گرفتاری کی مجبوری کی ساری عمر میں
ایک لمحہ تو بتا
جو ہمارے اور ہمارے ہی تصرف میں رہا
ایک تو لمحہ بتا

اپنی مرضی سے جسے ٹھہرا سکے
اپنا سب کچھ ہار کے بھی جس کو ہم لوٹا سکے
کم سے کم دل کھول کر جس کو کبھی اپنا سکے

(اوراق)

کرشن ادیب

رَو میں ہے رخشِ عمر.....!

چلو آج ہم موڑ دیں عمر کے تیز رَو رخش کو
اسی ایک سمتِ مخالف کی جانب

جہاں آج بھی میریا
شام ہوتے ہی نیلے سمندر کی کھاری ہواؤں میں لپٹی ہوئی
اپنے ہاتھوں میں بھر کر مئے خانہ ساز
کسی آنے والے مسافر کی تشنہ لبی کے تقاضوں کو سیراب کرنے کی ہے منتظر!

چلو شب کے بدنام اڈّوں پہ جائیں ذرا
کہ شاید ہمیں یاد کرتی ہوں وہ بدچلن لڑکیاں...
— جن کے جسموں کی قربت میں ہم نے گزاری تھیں راتیں کئی!

چلو آج ان سے شبابِ گذشتہ کی باتیں کریں!
کسی ایک دزدیدہ لذّت میں ڈوبے ہوئے بے تکلّف لطیفے سُنیں!

اور عمرِ گریزاں کے احساس کو بھول کر....
— ایک لمحے کو چہرے سے سنجیدگی کی تہیں کھُرچ دیں!

سبھی جانتے ہیں
سبھی مانتے ہیں
کہ عمرِ گریزاں سماعت سے محروم ہے!
پھر بھی عمرِ گریزاں کو آواز دے کر بلائیں مذا
وگرنہ کسی روز یہ تیز رَو رخش بھی
کہیں دُورِ فردا کے غم ناک صحرا میں بھٹکا ہوا،
تھک کے رہ جائے گا
— اجنبی رہ گزاروں پہ مر جائے گا!!

(اوراق)

ادیب سہیل

داغ پانی کے

مری چھت اک مصور ہے
میرے کمرے کی دیواروں پہ رس رس کر
برستے ابر سے اس نے کئی چہرے بنائے ہیں

مرے گھر والے کہتے ہیں
مرمت چھت کی جب کرنے چلے
دیوار کی چونا کلی بھی ساتھ کروا دو
— کہ یہ پھیلے ہوئے سے داغ پانی کے
بہت بدزیب لگتے ہیں
انہیں کیسے بتاؤں داغ پانی کے

میرے کمرے کی زینت ہیں
یہ سب صورت ہی صورت ہیں
یہ سب جلوے ہی جلوے ہیں
مجھے ان میں کسی جانے ہوئے چہرے کا روشن عکس ملتا ہے

(اوراق)

زاہد ڈار

نظم

اور ان لوگوں کی آواز سنو
جو ابھی دُنیا میں آئے ہی نہیں
زندگی اُونچے پہاڑوں سے اُتر آئی ہے
شہر میں ان کے سواگت کے لئے
دُھوپ نے آگ لگا رکھی ہے
اور تنہائی میں جلتے ہوئے ارمانوں کی
راکھ کو وقت نے دھو ڈالا ہے
اب ہمارے لئے امید نہیں
اب ہمارے لئے آرام نہیں
موت گو دُور ہے لیکن پھر بھی

چار سُو شہر میں خاموشی ہے
اور ہم ان کے لئے
جن کو آنا ہے ابھی دنیا میں
شہر کو چھوڑ کے اب جاتے ہیں
سبز، تاریک، گھنے جنگل میں
بارشیں، تیز ہوائیں، خوشبو
اور ان لوگوں کی آواز سنو
برف اور ریت پر قدموں کے نشاں
جانے والوں کے نظر آتے ہیں
آنے والوں کے نہیں
آنے والوں کی خبر صرف ہَوا لاتی ہے
نرم، خاموش، اُداسی کا بدن
جیسے خوابوں میں کسی عورت کا
جسم سائے کی طرح پھرتا ہے
اور سب خوف بکھر جاتے ہیں

اس کے جادو کا اثر ایسا ہے
کہ ہر اک چیز سے ٹکرانے کی
ٹوٹ جانے کی فنا ہونے کی
آرزو دل میں جنم لیتی ہے
ایسے آتی ہے وہ آواز جسے
سُن کے احساس یہ ہوتا ہے کہ اب دنیا میں
چند روز اور ٹھہرنا ہے ہمیں
اگلی منزل ہے کہاں؟
چاند پر؟ یا کسی سیارے میں
جو ہواؤں کی گزرگاہ نہیں
جس میں خوشبو ہے نہ رنگ
جس میں خوشیاں بھی نہیں، دُکھ بھی نہیں
اور اس سوچ کے آزار سے آزادی ہے
کہ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں
کہ یہاں آنے کا کیا حاصل ہے

اور جانا ہے کہاں ؟
ایسے لگتا ہے کہ ان لوگوں کی آواز بھی اک دھوکا ہے
جو ابھی دُنیا میں آئے ہی نہیں
صرف آواز ہے، آواز بھی اک دھوکا ہے
اور ہم دُھندلے خیالوں میں سفر کرتے ہیں
کوئی مرکز ہی نہیں — کوئی کنارا بھی نہیں
دُور، نزدیک، قدیم اور جدید
فاصلے کچھ بھی نہیں، وقت کے آئینے میں
ایک میلا سا لگا رہتا ہے،
جس میں ہر دَور کے انسان نظر آتے ہیں
رقص کرتے ہوئے انسان ستاروں کی طرح
اپنی گمنام چمک رکھتے ہیں
بعض انسان مگر
ایسے جلتے ہیں کہ جیسے سورج
یہ وہ دیوانے ہیں

جو اندھیرے میں اُتر جاتے ہیں
اور جب لَوٹ کے آتے ہیں تو سورج کی طرح
اپنی گرمی سے جلاتے ہیں ہمیں
اور طاقت بھی عطا کرتے ہیں
جیسے خوابوں میں کسی عورت کا
جسم آتا ہے جلاتا ہے ہمیں
اور طاقت بھی عطا کرتا ہے
اِن کی آواز سُنو جو یہاں موجود نہیں
اِن کی آواز جو آئے تھے کبھی
اِن کی آواز جو آئیں گے کبھی
اور ان لوگوں کی آواز سنو
جو نہ آئے تھے، نہ آئیں گے کبھی

(سویرا)

ذوالفقار احمد تابش

نظم

صبحدم اک تلاطم۔ کھلی آنکھ دُکھ میں شرابور نمناک لب
لرزشِ برگ و گل شاخ تا شاخ۔ چشمِ سیہ دیکھتی
کون صحرا میں سورج کی اندھی تمازت کو
باہنوں کے حلقے میں گھیرے ہوئے ہے
اُفق پر زمیں آسماں، تیرے ہونٹوں کی مانند
پیوست باہم دگر

دن ڈھلے راہ بھولی ہوئی اک کرن
چشم و لب، بام و در میں کسے ڈھونڈتی ہے
یہ سائے کہ ہجرت سرائے زمیں سے

فلک کی طرف سر اٹھائے کھڑے ہیں

ہمارے دکھوں کو دلوں کے سوا اب امان کون دے گا

ابھی رات ہوتے ہی تاریک گلیاں
سیہ اوڑھنی سے بدن ڈھانپ کے
اپنے پہلے گناہوں کی یادوں میں آہیں بھریں گی
دریچوں کو چھوتی گزرتی ہوئی شب
دبے پاؤں - سبزے پہ اپنے نشاں چھوڑ جائے گی
ہم بند کمروں میں چپ چاپ سوتے رہیں گے
کسے یہ پڑی ہے
کہ باہر نکل کر سیہ رات کی داستانیں سنے

(نیا دور)

سحر انصاری

دیمک

کتابوں کی دشمن
کتابوں کی دشمن بھی ایسی کہ لفظوں کے رشتوں کو یکسر مٹا دے
غنیموں کے لشکر کی جاسوس بن کر
فصیلوں کے ہمراہ شہروں کو ڈھانے کے سب گُر بتا دے
تو یوں ہو کہ سنسان ہو جائیں سب سانس لیتی ہوئی بستیاں ایک پل میں

خداوندِ حرف و معانی کی ہیکل کے بیدار کاہن
جو لفظوں کے معبد میں آنکھوں کی شمعیں جلائے
نوشتے کی تقدیر سے باخبر ہیں
کس افسردگی سے خود اپنی نگاہوں کو روداد ساری سناتے ہیں، دیکھو

یہاں سارے صفحے مرصع تھے پہلے
یہاں جدولیں تھیں طلائی
ہر ورق سحرِ شنگرف سے جگمگاتا تھا مانندِ دستِ حنائی
جہاں آج بنجر زمینوں کی وحشت برسنے لگی ہے
جہاں آج شامِ وفا حرف کی نکہتوں کو ترسنے لگی ہے
وہاں خطِ گلزار و طاؤس کے موسموں کا گزر تھا

یہ پس خوردہ و مسخ اوراق اک تازیانہ سوالات کا ہیں
خداوندِ لوح و قلم ہی بتائے
کہ تاراجیٔ لفظ و قرطاس کیا ہُنر ہے
کتابوں میں مٹی کے گھر آ کے تعمیر کرنے کا فن
عظمتِ حرف و تقدیسِ معنی سے کیوں بے خبر ہے!

(افکار)

تبسم کاشمیری

جسم کے اندر جسم کے باہر

میں نے زمین کی تپتی رگوں پر ہاتھ دھرے ہیں
میں نے زمین کی تپتی رگوں سے
تپتے لہو کو اُبلتے دیکھا ہے
اِن رستوں پہ، ان گلیوں پہ
پتھر جیسی سخت ہوا کے
سُرخ دھماکے دیکھے ہیں
رات کی متورم گھڑیوں میں
زرد مکانوں کے صحنوں میں
لہو کو گرتے دیکھا ہے
قطرہ، قطرہ، قطرہ

قطرہ قطرہ بنتے بنتے ایک سمندر
اک بے پایاں تپتا سُرخ سمندر
زرد مکانوں کی رگ رگ میں تپتا سُرخ سمندر
ان گلیوں کی بوڑھی چھال پہ عفریتوں کے حملے چیخیں
تپتی زمین کے ساتویں تلوے تک لہراتی اندھی چیخیں
کتنی ہی ظالم صدیوں سے
اندھی چیخیں میرے تپتے جسم کے جلتے خلیوں، زرد مساموں
کے دردوں میں بھٹک رہی ہیں
چیخیں میرے جسم کی اک اک رگ میں یورش کرتی ہیں
خوف کا اک تیکھا نشتر اجسم کو کاٹتا رہتا ہے
جسم کے باہر جسم کے اندر خون کا اندھا لاوا بہتا رہتا ہے
ان رستوں پر سُرخ سمندر کی یلغاریں سہتا ہوں

(اوراق)

اظہر جاوید

منافق دوستوں کے لئے ایک نظم

میں ہوں بے مہر یاروں کے جنگل میں الجھا ہوا
میں ہوں بے فیض چاہت کے جنگل میں ایسے کھڑا
جس طرح میرے چاروں طرف مصلحت کے گھنے پیڑ ہوں
جن کی چھاؤں میں بیٹھو تو کانٹے چبھیں
جن کی آواز سے خوف کے تیر دل میں کھبیں
یہ ستم کیشیاں، یہ جفائیں سبھی
سر جھکائے کھڑی ہیں وفائیں سبھی
سرنگوں پیار کی ہیں ادائیں سبھی
میرے شعروں کی تقدیس پامال ہے
میرے لفظوں کی حرمت بھی بے حال ہے

میرے اخلاص پر ہیں سبھی خندہ زن، غم رہا موجزن
میرے افکار میں، میرے انفاس میں،
میں بھٹکتا رہا، سر پٹختا رہا دُکھ کی دیوار سے
دوستوں نے پلٹ کر یہ پوچھا نہیں، اتنا سوچا نہیں
میں بھی انسان ہوں
مجھ کو بھی ہے تمنا کہ چاہے کوئی
میں نے جتنے بھی بے لوث نغمے لکھے
ہمدموں کے لئے، ساتھیوں کے لئے چاہتوں کے لئے
جتنے آنسو چُنے جتنے سپنے بنے
جتنے لمحوں کو الفت میں ضائع کیا
زندگی کے جواں خون کو کیسے مائع کیا
جیتے جی میں نے کیا کیا کیا
کاش! ان کو بھی اِک دِن سراہے کوئی
میری سوچیں غلط، میرے ارماں عبث
میں نے چاہا کہ خوشبو سے دامن بھروں

قید ہاتھوں میں موجِ صبا کو کروں
میں ہی پاگل تھا جو بھول بیٹھا اسے
میں ہوں بے مہر یاروں کے چنگل میں اُلجھا ہوا

(اوراق)

امجد اسلام امجد

گِلہ

گِلہ ہَوا سے نہیں ہے ہَوا تو اَندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹُوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے!
مگر وہ سر کہ جُھکے اور پھر کھڑے نہ ہوئے!
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے

گِلہ ہَوا سے نہیں تُندیٔ ہَوا سے نہیں
ہنسی کے تیر چلاتی ہوئی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے، اغیار کی جفا سے نہیں

گِلہ تو گرتے مکانوں کے بام و در سے ہے
گِلہ تو اپنے بکھرے ہوئے سفر سے ہے
ہَوا کا کام تو چلنا ہے اس کو چلنا تھا
کوئی درخت گرے یار ہے، اُسے کیا ہے
گِلہ تو اہلِ چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجر سے ہے
گِلہ سحر سے نہیں رونقِ سحر سے ہے

(نیا دَور)

سہیل احمد

ایک موسم کے دوستوں کے لئے نظم

میں ویران تالاب کے پاس بیٹھا ہوں تنہا،
ہوا چل رہی ہے،
درختوں سے گرتے ہوئے خشک پتوں کے انبار سے لگ رہے ہیں
پرانے مکانوں، درختوں سے آگے کھلے راستوں پر کوئی بھی نہیں ہے
بس اک شام سرما کی اُجڑی ہوئی دھوپ ہے اور فلک پر
اُداسی میں ڈوبے ہوئے چند بادل ہیں جو راہ بھولے ہوئے ننھے بچوں کی مانند
گُم سُم کھڑے ہیں
وہ کونجیں جو ہر سال آتی ہیں اس مرتبہ ان کے آنے کی کوئی خبر ہی نہیں ہے
وہ ہر سال آتی ہیں مہماں بن کر،
وہ ہر بار تالاب کے پاس کرتی ہیں آکر بسیرا،

وہ ہر بار ملتی ہیں مجھ سے
میں ہر بار کرتا ہوں کونجوں سے باتیں
وہ مجھ کو سناتی ہیں ہجرت کے رستوں، بہت دُور کے سرد شہروں، نئے
پانیوں اور نرالے علاقوں کی سب داستانیں
میں ہر بار ان کو بتاتا ہوں اس سال کیا کچھ ہوا ہے
میں اس بار بھی ان سے باتیں کروں گا
میں ان کو بتاؤں گا تالاب کے پاس بوڑھا شجر جو زمانوں سے چڑیوں کا مسکن تھا
اس مرتبہ آندھیوں میں وہ گر بھی چکا ہے
اِدھر سامنے جو مکاں تھا وہ بارش میں ڈھے بھی گیا ہے
وہ لڑکی جو اپنی اداسی میں تالاب کے پاس پہروں بھٹکتی بھی اب دوسرے شہر
کو جا چکی ہے
جہاں صاف میدان تھا اب وہاں کچھ نئے گھر بنے ہیں
وہ کونجیں مری ساری باتوں کو سنتی ہیں مجھ کو سناتی ہیں بچھڑے ہوئے
دوستوں کے فسانے
پھر اک روز وہ لوٹ جاتی ہیں اپنے گھروں، سرد ملکوں میں چھوڑے ہوئے مسکنوں کو،

مگر دوستی کے دِن اُڑتے رہتے ہیں تالاب کے پانیوں پر
یہ دن پھڑ پھڑاتے ہوئے ناچتے ہیں مری عمر کے سب دنوں پر
یہ دِن اڑتے جاتے ہیں سارے زمانوں سے آگے ابد کی حدوں تک!
یہ دِن اُڑتے پھرتے ہیں ہر سو بدلتی ہوئی رُت میں کونجوں کے پھر لوٹ کر
مجھ سے ملنے کے اچھے دنوں تک!!

(نیا دور)

سرمد صہبائی

ناچ اے نرتکی

(موہنجوڈرو کی رقاصہ کے نام)

ناچ، ہاں ناچ اے نرتکی
ناچ ان کے لئے جو جدائی کے صدمے میں ہیں
جن کی سانسوں کی دہلیز پر
اُن کے جسموں کے مہتاب گہنا گئے
جو چمکدار خواہش کی پوروں پہ چڑھتی جوانی کی بیلوں کو چھوتے ہی پتھرا گئیں
ناچ اُن کے لئے

جو جوانی کی پت جھڑ میں تنہائیوں کو پہن کر نکلتی ہیں
اور وصل کی رُت میں مہندی کی خوشبو سے ڈرتی ہیں
ہاں ناچ اے سانولی!

کہ تیری انگلیوں میں ہر سے موسموں کے نرت بھاؤ ٹھہرے ہیں
تو خواہشوں کے قبیلے میں سورج کا کنگن پہن کر
جبلّت کے موسم کے تہوار میں ناچتی ہے
سلامت رہیں یہ ترے نرت بھاؤ، سُبھاؤ
کہ ہم موت کے تابلو میں زمانے سے ساکت ہیں
آنکھوں کی پُتلی پہ صدیوں سے اک خواب کا عکس ٹھہرا ہے
اور تیرے روشن بدن کی مُدھر راگنی کھو گئی ہے
تھرک نرتکی
کہ تیرے لہلہاتے بدن کے تموّج سے دن رات چڑھتے اُترتے ہیں
صدیوں میں پھیلی ہوئی سیڑھیوں پر ترے گھنگھروؤں کی دھمک گونجتی ہے
تجھے ہم نے جنموں کی سنگت میں دیکھا ہے
ہاں ناچ اے نرتکی

ناچ اُجڑے دلوں میں، گہن خوردہ آنکھوں میں
سنسان جسموں میں، تیرہ سیہ بخت گلیوں میں
ماتم زدہ آرزوؤں میں

ہم پر دیا کر
کہ ہم موت کے تابلو سے نکل کر
ہمکتی ہوئی تازہ سانسوں کے موسم میں جاگیں
تڑپ سانولی، ہاں چمک باؤلی
جسم میں پھڑپھڑاتے لہو کے پرندے کے پَر کھول
گونگے لہو کو مدھر خواہشوں کے سُروں میں جگا
ہاں برس رَس بھری

کامنی

پدمنی
نرتکی
کہ دلوں کے طبل پر تیرے پاؤں کی چھَن چھنا چھَن
بیابان سینوں کی دَف پر تری انگلیوں کی چھما چھم
تڑپ نرتکی
کہ رگیں کھنچ کے تاریں بنیں
اور بدن ایک اک انگ تیرے مَدھر راگ کے تھرتھرائے سروں پر پگھل جائے

پوروں سے تیرے ترنم کی لذت کے جھرنے بہیں
سانولی، مدھ بھری
تیرے چڑھتے اُترتے نرت بھاؤ کی فاختائیں
جنم در جنم، دیس پردیس سارے گھروں کی منڈیروں پہ اڑتی رہیں
ماؤں کی چھاتیوں میں ترے لمس کا چشمہ پھوٹے
تیرے پاؤں کی تتلیوں کے تعاقب میں بچے ہمیشہ بھٹکتے رہیں
ناچ ہاں ناچ اے زندگی
کہ ہم موت کے تابلو میں زمانوں سے ساکت ہیں
اور تیری آنکھوں میں کھویا ہوا اپنا پچھلا جنم مانگتے ہیں
یہاں تیرے چرنوں کی مٹی میں ماتھے سے ٹوٹا تلک ڈھونڈتے ہیں

(پاکستانی ادب)

ریاض مجید

دائمی رفاقت کی بشارت

جو بُری سے بُری بات ہو سکتی تھی ہو گئی ہے
جو بڑے سے بڑا حشر ممکن تھا وہ مجھ پہ توڑا گیا ہے

مگر میں ابھی زندہ ہوں — اور —
میرے عناصر کی ترتیب بکھری نہیں ہے
ابھی سر سلامت ہے اور سر میں آوازۂ شور و شر گونجتا ہے
کہ آوارگی کے سفر کی ابھی ایک دو منزلیں اور بھی ہیں
ابھی ذہن پر سوچ کی وہ خراشیں نہیں ہیں جو آتے زمانے میں پچھتاوا بن کے
رستی ہیں اور بوڑھے لمحوں کو دوزخ بنا دیتی ہیں
ابھی آنکھ میں میرے دیکھے ہوئے رنگ محفوظ ہیں اور ماضی کی آواز
ڈوبی نہیں ہے

ابھی مجھ کو اس کی رفاقت میسر ہے جس کی محبت میرے جلتے سر پر
کسی مادرِ مہربان کی دعاؤں کی مانند سایہ فگن ہے
ابھی شہر بھر سے نگاہیں ملانے کی ہمت ہے مجھ میں کہ میں سربلند آج بھی ہوں

میں جیسا بھی ہوں مطمئن ہوں
اور ہر روز آنکھوں میں خود اعتمادی و خود آگہی کی چمک لے کے گھر سے نکلتا ہوں
مگر میرے دشمن میں اتنی سکت ہی کہاں ہے کہ وہ میری جانب نظر بھی اُٹھائے
کہیں شہر میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے تو نگاہیں جُھکا کے گزر جاتا ہے
اُسے علم ہے کہ میرے ہاتھ پر ایک روشن زمانے کی آمد کا اعلان مرقوم ہے
اور وہ اس کو مٹانے سے قاصر ہے
(مجھے اپنے دشمن کی بے چارگی پر بہت رحم آتا ہے)

(تحریریں)

انور محمود خالد

دس دِن پہلے

وہ دن کتنی تیزی سے نزدیک آتا چلا جا رہا ہے
کہ جو میرے تیرے تعلق کی زنجیر کے نرم حلقوں کو
اِک دوسرے سے جدا کر کے
یوں وقت کی دھول میں گُم کرے گا
کہ پھر یاد کی دیو داسی — کھلے سر
ہتھیلی پہ جلتا دیا رکھ کے جب
دِل کے پُر پیچ رستوں میں تنہا پھرے گی
تو وہ اپنی نم ناک آنکھوں سے خود دیکھ لے گی
کہ اس نامرادی کی تاریک شب میں
مجھے راستوں پر

مٹی الفتوں کے کسی آہنی زنگ آلود حلقے کے ریزوں کا نام و نشاں تک نہ ہوگا
محبّت کے برسوں سے قائم وہ مضبوط رشتے
کبھی اتنے کمزور ہو کر فراموش ہو جائیں گے
اس کا وہم و گماں تک نہ ہوگا!
وہ دن کتنی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے
مگر میں کیسے یہ بتاؤں —
مرا دلِ سکوں کی الوہی حلاوت سے نا آشنا ہے
میں کیسے بتاؤں —
مقدر کے قاضی کا کیا فیصلہ ہے
— یہی عمر بھر کی سزا ہے
ہمارے نصیبوں میں اک دوسرے کی رفاقت نہیں ہے
ہماری محبّت
ادھورے المناک خوابوں کا وہ سلسلہ ہے
کہ جو بے جہت پھیلتا جا رہا ہے
مگر جن کی قسمت میں

پانی میں پھینکے ہوئے کنکروں سے بنے اَن گنت دائروں کی طرح
اپنی تکمیل خود دیکھنے کی مسرت نہیں ہے!

وہ دِن کتنی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے
کہ جب آخری بار
اِک دوسرے کو خموشی سے ہم
ڈبڈبائی ہوئی آنکھ سے
آنسوؤں کی زباں میں وہ پیغام دیں گے
جنہیں کپکپاتے ہوئے ہونٹ کہنا تو چاہیں گے
لیکن نہ کہہ پائیں گے
— اور آنکھوں کی سیّال تحریر میں جو بلاغت ہے
لفظوں میں کب ہے!

(تحریریں)

فہمیدہ ریاض

جاگتی مٹّی

رات تلملاتی ہے
بے بسی کے پنجے میں
ہانپتی غصیلی رات!
میری کوکھ میں ہر آن
پل رہا ہے سناٹا
اور میری تنہائی
چوستی ہے سینے سے
گرم دُودھ کا دھارا
عمر بھر کی کڑواہٹ
پوچھنے لگی اِک بار

زہر یہ بھی پینا ہے؟
ساری رات جینا ہے؟

پھر یہ کیسا دھیان آیا
شانت ہو گئی کایا
بھولے بسرے سنگی کا
کوئی بول نرمی کا
"پیار ہی تو جیون ہے"
میرے گرم ماتھے پر
میرے گرم ماتھے پر
کوئی پیار کرتا ہے
جیسے نرم ہاتھوں نے
خشک کر دیئے آنسو
بتیوں کی جھالر سے
ٹوٹنے لگے جگنو
سو رہا ہے سب سنسار

جاگتی ہے بس مٹی
اِس سمے تو آنکھوں کے
بیج پھوٹتے ہوں گے
اب جو آئی پروائی
رات کی مہک لائی
یہ گمان ہوتا ہے
جس طرح میرا پریمی
میرے پاس سوتا ہے

(پاکستانی ادب)

سرور کامران

صُبح کی دُعا

روشنی، میری ماں
چھاتیاں کھول دے
اپنے سینے سے اُگتی ہوئی برکتیں میرے نزدیک لا
میری آنکھوں کے غمناک آتشکدوں پر چھڑک
میرے نزدیک آ
مجھ کو اپنے گلے سے لگا
میرے ہر سمت پھیلے دھندلکوں کی تکذیب کر

میرے پاؤں میں صدیاں، مسافت کے صحرا کی زنجیر ہیں

نیست سے ہست تک کے خلا میں ازل سے ابد تک
اکیلا ہوں میں

میرے ہر سُو،
مرے جسم و جاں پر برستی
سوالات کی کند تیغوں کے انبار ہیں
میں تجسس کے اس کھولتے زہر سے، سُرخ تانبے کے مانند ہوں
میرا ایک ایک پل، بیکراں پھیلتے دائروں کے سوا کچھ نہیں
میں اُفق تا اُفق، دم بدم۔ ایک صحرا کی اڑتی بکھرتی ہوئی ریت ہوں
مجھ کو ہر سمت سے دودھیا بازوؤں، نرم ہاتھوں کے حلقے میں بھر
میرے نزدیک آ
مجھ کو ہونے نہ ہونے میں
آشوبِ تشکیک کی رزم گہہ میں، سرفراز کر
میرے چہرے کو اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتیوں میں چھُپا
اپنے باطن کو ظاہر بنا
مجھ پہ ہر بھید کو کھول دے

لفظ کو میرا محکوم کر۔ تاکہ میں
دوسروں کو سفر کی کہانی سنانے کا کوئی وسیلہ بنوں
تاکہ ہر ایک پر میری سوچوں کا سِم سِم کھُلے!

(اوراق)

ناھید قاسمی

خانہ بدوش

(۱)

وہ سمٹی سکڑی سی ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہے ننھی میلی کچیلی گڑیا
وہ آج بلقیس کی نگاہوں میں کالی ڈائین ٹھہر چکی ہے
نہ اس کی آنکھوں میں کوئی موتی
نہ اس کے گالوں پہ کوئی لالی
نہ اس کے کپڑوں میں رنگ باقی
نہ کوئی آہنگ اس کی چابی میں
آج بلقیس کی سبھی دوستوں نے اس سے کہا تھا:
"کوڑے کے ڈھیر پر اس کو ڈال آؤ
کہ اب یہ کالی کلوٹی ہم کو ڈرا ہی دے گی
چڑیل سی تو ہے، کھا ہی لے گی"

(۲)

وہ میلے کپڑوں میں مسکراتا گلاب، ایسا شگفتہ لڑکا
پرانے ورقوں سے بھر کے لایا ہے اپنی بوری
وہ ٹاٹ کی جھونپڑی کی جانب لپکتا جائے
وہ کتنا خوش ہے
کہ آج کی رات جشن کی لمبی رات ہوگی
نہ ایک روٹھے گا دوسرے سے، نہ کوئی فاقے کی بات ہوگی
کہ اس کی میلی قمیص کی جیب میں ہے میلی کچیلی گڑیا
جو اس کی گلنار، پریوں جیسی حسین بہنا کے مدتوں سے ڈھلکتے اشکوں کو
پونچھ دے گی
کئی دنوں سے وہ روٹھی روٹھی سی پیاری تتلی
گلاب بھیّا کے پھیلے سینے میں چھپ کے اس کو ہنسا ہی دے گی
رُلا ہی دے گی

(فنون)

حامد جیلانی

کوئی دُود سے بن جاتا ہے وجُود

آدھی رات کو فون بجا

.....

اور اُبھری اک انجانی مغلوب صدا
اپنی چیخ کی دہشت سے
ابھی ابھی وہ جاگی ہے معلوم ہوا

"بیضوی چہرہ
بے صورت
سر پر مُڑے تُڑے دو سینگ
اور سینے کے وسط میں اِک

پنج کونی آنکھ
آنکھ کی پتلی میں میرا ہی عکس مقید
آتش فشاں پہاڑ کی گہرائی سے ابھر کر
خونی پنجے
بھنچ بھنچ کر
کھردرے لہجے میں وہ چیخا:
اپنی مرضی کی تو صبح بستر پر
جسم نہیں
مکڑی کا جالا پاؤ گی
میرا حکم ہے — آجاؤ
اور برہنہ ہوتے ہی
مجھ کو چھو کر
میرے جیسی بن جاؤ
آجاؤ
آجاؤ
آجاؤ
....."

(سیپ)

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

پروین شاکر

بائیسویں صلیب

صبح کے وقت، اذاں سے پہلے
اب سے بائیس برس قبل ۔ ادھر
عمر میں پہلی دفعہ روئی تھی میں
کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ سنی، تو مری ماں
ہنس دی تھی

میری آواز نے اس کو شاید
اس کے ہونے کا یقیں بخشا تھا
دُکھ کے اک لمبے سفر اور اذیت کی کئی راتیں
بسر کرنے کے بعد
اس نے تخلیق کیا تھا مجھ کو

میری تخلیق کے بعد اس نے نئی زندگی پائی تھی جسے
آنسوؤں نے مرے، بپتسمہ دیا

ہر نئے سال کی چوبیس نومبر کی سحر
دُکھ کا اک رنگ نیا لے کے مرے گھر آتی
اور میں ہر رنگ کے شایانِ سوا گت کے لئے
نذر کرتی رہی کیا کیا تحفے

کبھی آنگن کی ہری بیلوں کی ٹھنڈی چھایا
کبھی دیوار پہ اُگتے ہوئے پھولوں کا بنفشی سایا
کبھی آنکھوں کا کوئی طفلک مرحوم۔ کبھی خوابوں کا
کوئی شہزادہ کہ تھا قاف کا رہنے والا
کبھی نیندوں کے مسلسل کئی موسم۔ تو کبھی
جاگتے رہنے کی بے اَنت رُتیں
درس میں بھیگی ہوئی برسات کی کاجل راتیں
چاندنی پی کے مچلتی ہوئی چنچل راتیں،

وقت نے مجھ سے کئی دان لئے

اس کی باہیں — مری مضبوط پناہیں لے لیں
حد تو یہ ہے کہ وہ بے فیض نگاہیں لے لیں
رنگ تو رنگ تھے — خوشبوئے حنا تک لے لی

سایۂ ابر کا کیا ذکر — ردا تک لے لی
کانپتے ہونٹوں سے موہوم دُعا تک لے لی
ہر نئے سال کی اک تازہ صلیب
میرے بے رنگ دریچوں میں گڑی
قرضِ زیبائی طلب کرتی رہی
اور میں تقدیر کی مشاطۂ مجبور کی مانند — اِدھر
اپنے خوابوں کا لہو لے لے کر
دستِ قاتل کی حنا بندی میں مصروف رہی
اور یہاں تک کہ صلیبیں مری قامت سے
بڑی ہونے لگیں
ہاں کبھی نرم ہوا نے بھی کواڑوں پہ مرے دستک دی

اور خوشبو نے بھی کچھ دھیرے سے سرگوشی کی
رنگ نے کھیل رچانے کو کہا بھی ۔ لیکن
میرے اندر کی یہ تنہا لڑکی
رنگ و خوشبو کی سکھی بن نہ سکی
ہر نئی سالگرہ کی شمعیں
میرے ہونٹوں کے بجائے
شام کی سرد ہوا نے گل کیں
اور میں ویران دریچوں میں ٹکائے سر کو
خود کو تقسیم کے نادیدہ عمل میں سے گزرتے ہوئے
بس دیکھا کی
آج اکیس صلیبوں کو لہو دے کے خیال آتا ہے
اپنے بائیسویں مہمان کی کس طرح پذیرائی کروں
آج تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں
ماں کی خاموش نگاہیں
میرے اندر کے شجر میں کسی کونپل کی مہک ڈھونڈتی ہیں

اپنے ہونے سے میرے ہونے کی مربوط حقیقت کا
سفر چاہتی ہیں

خالی سیپی سے گہر مانگتی ہیں
میں تو موتی کے لئے گہرے سمندر میں اُترنے
کو بھی راضی ہوں — مگر
ایسی برسات کہاں سے لاؤں
جو مری مرگ بجاں روح کو بپتسمہ دے !

(فنون)

خورشید رضوی

نیلے پہاڑ

پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ
دُور اُفق پر آسمانوں سے ملے
سبز پیڑوں کی قطاروں سے پرے
پا پیادہ گاؤں کی جانب رواں
سادہ دل انجان بُڑھیا کی طرح
بادلوں کی گٹھڑیاں سر پر رکھے
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

جانے کب قدموں کی زنجیریں کٹیں
جانے کب رستے کی دیواریں ہٹیں

قفل ٹوٹیں حاضر و موجود سے
جانے کب بادل کے رتھ پر بیٹھ کر
بجلیوں کے تازیانے مارتا
بارشوں کے پانیوں میں بھیگتا
میں اڑاؤں آندھیوں کے راہوار
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ!!

(اوراق)

سجاد بابر

سامنا

مرے شہر میں اجنبی ہو!
بہت خوب
آؤ تمہیں کیوں نہ میں شہر کی سیر کو لے چلوں
شہر کے مشرقی رُخ کی جانب سے آغاز کر لیں
یہ کہنہ فصیل اتنے رختوں پہ ٹھہرا ہوا جسم لے کر
زمانوں کی یلغار کو روکتی ہے
بس اب اس کی تعمیرِ نو کی گھڑی ہے!

یہ دروازہ، بوسیدہ اور زنگ خوردہ، کشادہ کشادہ،
کوئی دن میں آراستہ ہونے والا ہے

آؤ چلے آؤ، بازار میں رُکنا بہتر نہیں ہے
کہ بازار ہر دور میں ایک سے ہی رہے ہیں
یہ دیکھو، پرانے مکانات اب تک یہاں
پیٹھ سے پیٹھ جوڑے کھڑے ہیں
ڈرو مت، ابھی ان کی قسمت میں ڈھینا نہیں ہے
مکیں دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ گلی کی طرف سے چلیں گے
یہ گلیاں، یہ تاریک گلیاں .....
بس اب روشنی میں نہانے ہی والی ہیں!
شاید تعفن سے گھبرا رہے ہو!
یہ بدرو جو ٹھہری ہوئی ہے .... کوئی پل میں بہنے لگے گی!
وہ دیکھو، مری ڈیوڑھی سامنے ہے

.....

چلے جاؤ! تم کون ہو؟
یوں مرے ساتھ کیوں آ رہے ہو!!

(فنون)

زندہ رہنے کی کوشش

کتنا اچھا لگتا ہے
کبھی کبھی جب سرد رات میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں
کبھی کبھی جب آسمان پر اُجلے بادل نئے نئے بہروپ بدل کر
ہم کو حیران کرتے ہیں
کبھی کبھی جب کوئی پرانا ساتھی ہم سے ملتا ہے
کبھی کبھی جب وقت سے پہلے گھر کی جانب لوٹتے ہیں
کبھی کبھی جب الماری کی ساری کتابیں
دھوپ میں رکھے بیٹھ کر ان کو دیکھتے ہیں
کبھی کبھی جب کوئی چڑیا
دیر سے چپ کمرے کے روشن دان سے جانے کس کو صدائیں دیتی ہے

کتنا اچھا لگتا ہے
تم نے کبھی محسوس کیا
ان لمحوں میں ایک عجیب سی سُکھ چادر تن جاتی ہے
ساری دنیا جیسے سمٹ کر اک منظر بن جاتی ہے

(افکار)

اصغر ندیم سید

اپنی موت پر ایک نظم

اور جب تم مجھے زہر آلود، فاسد زمین میں اتارو تو کوئی نصیحت نہ کرنا
مجھے یہ نہ کہنا کہ خوشبو تمہاری حفاظت کرے گی
مجھے ایسے اعلان کا حوصلہ بھی نہیں چاہیئے، جس کا لہجہ عقیدت سے لکنت زدہ ہو گیا ہے
مجھے یہ نہ کہنا!
ہماری دعائیں زمیں تنگ ہونے کی منحوس عادت پہ غلبہ کریں گی
تمہارے لئے سب سوالات آسان ہوں گے
تمہارے لئے سبز لوبان کی باس جلتی رہے گی،
ہواؤں کی روتی ہوئی دُھند میں
بارشوں کی سنکتی ہوئی ڈور میں
لمحہ لمحہ بگڑتے ہوئے جسم پر جب تعفن کے گدھ آ کے اُتریں

تو ان کو نحوست کے بہتان سے مت ڈرانا
انہیں مت ڈرانا کہ وہ مجھ سے ہیں

میری شاخوں پہ بجھتا ہوا خون مصرف کے چنگل میں سہما ہوا
جانکنی کے عمل سے گذرنے لگا ہے
اور جب تم مجھے اپنے بیزار کاندھوں پہ لے کر چلو گے تو بازار کے لوگ
اپنی گواہی کا تریاق دیں گے

میں اپنی گواہی پہ زندہ تھا
اب چل بسا ہوں
کہ لفظوں کی تاجر ہوائیں کسی سنگدل دیس کو اڑ گئی ہیں
اور جب تم زمیں کے مقفل کواڑوں کو کھولو!
وہاں کالی مٹی کا تالاب ہوگا
اگر اس میں قرنوں کے سب جانور بھوکی آنکھوں سے میرا سواگت کریں
تو مجھے مسترد کر کے تم لوٹ جانا

اور جب تم مجھے مشترک کاوشوں سے زمیں میں اتارو،
تو آواز دینا
رفیقو!
کہ ہم اس زمین سے مکمّل ہیں
یہ خاک صورت مکاں دیرپا ہے
رفیقو!
یہ بنیادی رسموں سے پہلو تہی کرنے والا عقیدت سے خود کو سپردِ زمیں
کر رہا ہے
تمہیں جب وراثت کے جھگڑوں سے فرصت ملے
تو کسی روز میری جبیں پر کوائف کی تختی لگانا
کہ پہچان ہوتی رہے
اور سکولوں کے بچے بہت شوق سے ایسی تحریریں پڑھتے رہیں

(اوراق)

ظفر سلطان

راہباؤں کے نام

تمہارے اُجلے بدن سے برگد کا پیڑ اچھا
کوئی مسافر جو تھک کے بیٹھے تو دو گھڑی کو قرار پائے
تمہارے اُجلے لباس سے بادبان اچھا
جواں سمندر کی تیز موجوں میں زندگی کا یقیں دلائے
تمہاری زلفوں کی چھاؤں سے سائبان بہتر
جو بادلوں کی ستم ظریفی پہ اپنی رحمت کو عام کر دے
تمہارے ہونٹوں کے پھول ایسے
جو اپنی خوشبو سے جی چرائیں
تمہاری آنکھوں میں خواب اُتریں

تو اپنی تعبیر بھول جائیں
تمہارا اپنا وجود چاندی کا کھوٹا سکّہ
جو جیبِ قدرت میں جانے کب سے پڑا ہوا ہے
نہ جانے کب تک پڑا رہے گا

(پاکستانی ادب)

جمیل ملک

نسیم شمائل پوری کی یاد میں

نہ ایسے طے کبھی یارو وفا کا مرحلہ ہوگا
"خرامِ ابرؔ کی صورت وہ آیا بھی تو کیا ہوگا

وہ یوں تو دیکھنے میں سامنے بیٹھا ہوا ہوگا
مگر اک سانس کی ڈوری کا رشتہ کٹ چکا ہوگا

کبھی بارش میں وہ چھم چھم چھما چھم بہہ گیا ہوگا
کبھی قوسِ قزح سے رنگ بن کر جھانکتا ہوگا

کبھی مہتاب راتوں میں تبسم کی ضیا ہوگا
کبھی وہ پھول سے چہروں پہ شبنم کا دیا ہوگا

چمن زاروں میں دیکھو وہ گلوں سے کھیلتا ہوگا
نظر آتا نہیں تو خود بھی خوشبو بن گیا ہوگا

گھنیرے جنگلوں میں کتنی برساتیں ہوئی ہوں گی
پپیہا "پی کہاں ہے، پی کہاں ہے" چیختا ہوگا

محبت کے ستارے اس کی آنکھوں میں چمکتے تھے
فلک پر جگنوؤں کے شہر میں وہ جا بسا ہوگا

سحر ہوگی تو اترے گا حسیں کرنوں کے زینے سے
دیئے کی لَو میں شاید رات بھر وہ کانپتا ہوگا

نسیمِ جانفزا ہو یا سکوتِ شامِ ہجراں ہو
وہ کس کس روپ میں آ آ کے ہم سے بولتا ہوگا

بھرے شہروں کو تنہا کر دیا جس جانے والے نے
ذرا سوچو وہ خود بھی کتنا تنہا ہو گیا ہوگا

کھلی آنکھوں جمالِ روئے تاباں کس نے دیکھا ہے
مندی آنکھوں سے وہ حسنِ دو عالم دیکھتا ہوگا

ہر اک دل میں چٹک اس کی ہر اک لب پہ مہک اس کی
سبھی کا آشنا تھا وہ تو کس کا آشنا ہوگا

جمیلؔ اب فرق کیا باقی ہے ہونے یا نہ ہونے میں
جُدا ہم سے ہوا تھا وہ ہمیں سے آ ملا ہوگا

(اوراق)

اسرار زیدی

اپنی ذات کا نوحہ

سفر کی شب کتنی مختصر ہے
یہ شب زمان و مکان کی گردش کے
عرصۂ بے ثمر کا حاصل!
یہ شب اذیت سے بہرہ ور ہے
سفر کی شب کتنی مختصر ہے!

جہاں قیام و سکون کے لمحوں میں
صرف بے رُوح قبر بتوں کا غبار
کوہِ الم کی سفاک گھاٹیوں میں مچل رہا ہے
جُھلستے صحرا، لہو اُگلتے ہوئے بیابان

چیختے ریگزار کیا کیا دہائی کریں گے
دکھوں کے متواج بحر جن کے عمق کی تہ میں
کئی دفینے جمے ہوئے ہیں
کئی سفینے تھمے ہوئے ہیں

بچھڑنے والے تو اپنی عظمت کے پرچموں کو
اُڑاتے منزل پہ جا گزیں ہیں
سلگتی روحوں کے کرب کیسے سمٹ سکیں گے
دُکھوں کے اس دوہرے کرب سے روح چیخ اٹھی ہے
بچھڑنے والوں کی موت کا غم ہی جانگسل تھا
خود اپنے ہونے کا کرب بھی کچھ
عذاب دوزخ سے کم نہیں ہے
سفر کی شب کتنی مختصر ہے

(قند۔ مجید امجد نمبر)

مسعود منوّر

مجید امجد کے لئے ایک سوز

نہ یہ موسم پیلو لایا نہ دن چڑھا جوانی
نہ اب جنڈ پہ ترکش لٹکے نہ اب ٹوٹے کانی
دُور دُور تک کھڑے سروٹے دور دور تک پانی
کس سے ہو سنجوگ سجن کا، کون کسی کا ہانی

باتیں اس کی پھول بنفشی، جن کی باس نویلی
اس کی نظم حنائی سپنا جیسے کڑی اکیلی
اس کا لہجہ شبنم بھیگا، رُت کی سبز پہیلی
یارو مجید امجد کیا بچھڑے بچھڑ گیا ہریلی

بچھڑے یار مناؤں کیسے، کیسے ان کو لاؤں
قبر کو جانے والا رستہ بند برابر پاؤں ،
لیکن جب میں چلتے چلتے، چلنے سے تھک جاؤں
تیری بند کتاب کے اندر نظم کے در تک آؤں

(قند)

اُردو غزل کی نئی جہت

غزلیں

(دوسرا ایڈیشن)

وزیر آغا

قیمت دس روپے

مکتبۂ اُردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا